اس نے الہ آبادیوں کی سیوا اور ہمدردی اس طرف متوجہ کر دی تھی۔ پرتاپ اس انجمن کا روح رواں تھا۔ پچھلے دو سالوں میں اس نے طاعون کے دنوں میں بھی جبکہ لوگ اپنے پیاروں کو چھوڑ دیا کرتے ہیں اب جان ہتھیلی پر رکھ کر طاعون زدہ خطوں میں علاج معالجہ شروع کر دیا تھا۔

کملا چرن جس وقت الہ آباد پہنچا م پرتاپ چند نے اس کی بڑی آؤ بھگت کی۔ مرورایام نے اس کے دل سے حسد کی آگ بجھا دی۔ جس وقت وہ برجن کی بیماری کی خبر پا کر بنارس پہنچا تھا اور اس سے ملاقات ہوتے ہی برجن کی حالت دیکھ کر سنبھل چلی تھی اسی وقت سے پرتاپ چند کو یقین ہو گیا کہ کملا چرن نے اس کے دل میں وہ جگہ نہیں پائی جو میرے لیے مخصوص تھی۔ یہ خیال حسد کا شعلہ فرو کرنے کے لیے کافی تھا، علاوہ اس کے یہ خیال بھی اکثر اسے بے چین کرتا تھا۔ کہ میں ہی سوشیلا کا قاتل ہوں۔ میری ہی بدزبانیاں اس غریب کی جان لیوا ہوئیں اور اسی وقت سے جبکہ سوشیلا نے مرتے وقت اس سے رو رو کر اپنی خطاؤں کی معافی مانگی تھی، پرتاپ نے ارادہ کر لیا تھا کہ موقع ملا تو میں اس گناہ کی تلافی ضرور کروں گا۔

کملا چرن کی خاطر و مدارات اور تعلیم و تربیت نے اسے کسی حد تک پراشچت کے پورے کرنے کا نادر موقع ہاتھ آیا۔ اگرچہ علم و شعور میں وہ کملا چرن سے منزلوں آگے تھا مگر اس سے یوں پیش آتا جیسے چھوٹا بھائی بڑے بھائی کے ساتھ اپنے وقت کا کچھ حصہ اس کی مدد کرنے میں صرف کرتا اور ایسی سہولت سے اتالیق کا فرض ادا کرتا کہ تعلیم ایک دلچسپ مباحثہ کی صورت اختیار کر لیتی۔

مگر پرتاپ چند کی ان کوششوں کے باوجود کملا چرن کی طبیعت یہاں بہت گھبراتی۔ سارے بورڈنگ ہاؤس میں اس کے مذاق کا ایک بھی آدمی نہ تھا جس سے وہ اپنا درد دل کہتا اور اپنے زخم جگر پر مرہم رکھواتا۔ وہ یار باش، بے فکر رنگین مزاج آدمی تھا جس نے سوائے آج کے کل کا کبھی خیال نہیں کیا۔ پرتاپ سے باوجود بے

تکلفی کے وہ دل کی بہت سی باتیں نہ کہہ سکتا تھا، جب اکیلے پن سے طبیعت بہت اکتاتی تو برجن کو کوسنے لگتا کہ میرے سر پر یہ سب مصیبتیں اسی کی لائی ہیں۔ اسے مجھ سے انس نہیں ہے۔

زبان اور قلم کی محبت بھی کوئی محبت ہے، وہ محبت ہی کیا جو موقع اور مصلحت کی آڑ ڈھونڈنے لگے۔ میں چاہے ان پر جان ہی کیوں نہ دے دوں مگر ان کی محبت زبان او رقلم کے دائرے سے باہر نہ نکلے گی۔

ایسے بت کے روبرو جو پسیجنا جانتا ہی نہ ہو سر پٹکنے سے کیا فائدہ حاصل۔ ان خیالات نے یہاں تک زور پکڑا کہ اس نے برجن کو خط لکھنا ہی چھوڑ دیا۔ وہ بیچاری اپنے خطوط میں کلیجہ نکال کر رکھ دیتی مگر کملا جواب تک نہ دیتا اور دیتا بھی تو خشک اور دل شکن۔ اس وقت اسے برجن کی ایک ایک بات، اس کی ایک ایک حرکت اس کی سرد مہری کا پتہ دیتی تھی۔ ہاں اگر یاد نہ آتی تھیں تو برجن کی خاطر داریاں اور دل سوزیاں، وہ نشیلی آنکھیں جو اس سے جدا ہوتے وقت ڈبڈبا گئی تھیں اور وہ نازک نازک ہاتھ جنہوں نے باہم مل کر اس سے منتیں کی تھیں کہ خط برابر بھیجتے رہنا۔ اسے یاد آجاتے تو ممکن تھا کہ اسے کچھ تسکین ہوتی مگر ایسے موقوں پر انسان کا حافظہ دھوکا دے دیا کرتا ہے۔

آخر کملا چرن نے اپنی تنہائی کا ایک مشغلہ سوچ ہی نکالا۔ جس وقت سے اس نے ہوش سنبھالا تھا، اسی وقت سے بازار حسن کی سیر شروع کی، حسن پرستی اس کا خمیر ہوگئی تھی۔ اور قسم کا کوئی مشغلہ اس کے لیے ایسا ہی ضروری تھا جیسے بدن کے لیے غذا۔ بورڈنگ ہاؤس سے ملا ہوا ایک سیٹھ کا باغیچہ تھا اور اس کے رکھ رکھاؤ کے لیے ایک مالی نوکر تھا۔ اس نوکر مالی کی ایک دوشیزہ لڑکی سرجو دیئی تھی اگر چہ بہت حسین نہ تھی مگر کملا حسن کا اتنا طلبگار نہ تھا، جتنا کسی دل بستگی کے مشغلہ کا۔

کوئی عورت جس کے چہرے پر شباب کی جھلک ہو اس کا دل بہلانے کے لئے

موزوں تھی۔ کملا اس لڑکی پر ڈورے ڈالتے شام سویرے بلا ناغہ چمن کی روشوں پر ٹہلتا نظر آتا۔ اور لڑکے تو میدان میں ورزش کرتے مگر کملا چرن باغیچہ میں آ کر تاک جھانک میں مصروف رہتا۔ رفتہ رفتہ اس نے سرجودئی سے شناسائی، ہمدردی اور پھر محبت پیدا کر لی۔ اس سے سے گجرے مول لیتا اور نقد قیمت کے علاوہ چوگنے دام دیتا۔ مالی کو تہوار کے موقع پر سب سے زیادہ تہواری کملا چرن سے ہی ملتی۔ یہاں تک کہ سرجودئی بھی اس کے دام الفت کی سیر ہو گئی اور دو ایک بار تاریکی کے پردے میں باہم ملاقاتیں بھی ہوئیں۔

ایک روز شام کا وقت تھا۔ سب طلبا سیر کو گئے ہوئے تھے۔ کملا چرن اکیلا باغیچہ میں ٹہلتا تھا۔ اور رہ رہ کر مالی کے جھونپڑے کی طرف جھانکتا۔ یکا یک جھونپڑے میں سے سرجودئی نے اسے اشارہ کیا اور کملا بڑی تیزی سے اندر گھس گیا۔ آج سرجودئی نے ململ کی ساڑھی پہنی تھی جو کمل ابابو کا تحفہ تھی۔ سر میں خوشبودار تیل ڈالا جو کملا بابو بازار سے لائے تھے اور ایک چھینٹ کا شلوکا پہنے ہوئے تھی جو انہیں بابو صاحب نے بنوا کر دیا تھا۔ یہ سب کملا بابو کی خاطر تھی۔ اپنی طرف سے سرجودئی نے صرف آنکھوں میں کاجل لگایا تھا۔ آج وہ اپنی نگاہ میں بہت حسین معلوم ہو رہی تھی۔ ورنہ کملا چرن جیسا امیر اور حسین آدمی اس پر جان دیتا۔

کملا چرن کھٹولے پر بیٹھا ہوا اس کی اداؤں کی مستانہ نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ اس وقت سرجودئی برجن رانی سے کسی طرح کم حسین نہیں نظر آتی تھی۔ رنگت میں ذرا سا فرق تھا مگر یہ کوئی ایسا بڑا فرق نہیں تھا۔ اس کی نگاہ میں سرجودئی کی محبت سچی اور زیادہ پرجوش معلوم ہوتی تھی کیونکہ وہ جب کبھی بنارس جانے کا تذکرہ کرتا تو سرجودئی زار زار رونے لگتی اور کہتی کہ مجھے بھی لیتے چلنا۔ میں تمہارا ساتھ نہ چھوڑوں گی۔ کہاں یہ محبت کی گرمی اور جذبات کا زور اور کہاں برجن کی نیم دلانہ خاطر داریاں اور بے رحمانہ مصلحت آمیزیاں۔

کملا ابھی اچھی طرح آنکھوں کو سینکنے بھی نہ پایا تھا کہ یکا یک مالی نے دروازہ آ کر کھٹکھٹایا۔ اب کوٹو تو بدن میں لہو نہیں، چہرہ کا رنگ اڑ گیا۔ سر جودیئی سے گڑگڑا کر بولا۔

''میں کہاں جاؤ؟''

سر جودیئی کے آپ ہی ہوش اڑے ہوئے تھے، گھبراہٹ میں زبان سے کچھ بات نہ نکلی۔ اتنے میں مالی نے پھر زنجیر کھٹکھٹائی، سر جودیئی بے بس تھی۔ اس نے ڈرتے ڈرتے ایک کواڑ کھول دیا۔ کملا چرن ایک کونے میں دبک کر کھڑا ہو گیا۔

جس طرح بھینٹ کا بکرا کٹار کے تلے تڑپتا ہے، اسی طرح کونے میں کھڑے ہونے والے کملا کا دل دھڑک رہا تھا۔ وہ اپنی زندگی سے مایوس تھا اور ایشور کو صدق دلی سے یاد کر کے کہہ رہا تھا کہ اگر اب کی بار اس مصیبت سے رہا ہو جاؤں تو پھر کبھی ایسی حرکت نہ کروں گا

اتنے میں مالی کی نگاہ حضرت پر پڑی، پہلے تو کچھ گھبرایا پھر نزدیک آ کر بولا

''یہ کون کھڑا ہے، یہاں کون ہے؟''

اتنا سننا تھا کہ کملا چرن تیزی سے باہر نکلا اور پھاٹک کی طرف بگٹٹ بھاگا۔ مالی ایک ڈنڈا ہاتھ میں لیے ''دیکھنا دیکھنا بھاگنے نہ پاوے'' کے نعرے مارتا ہوا پیچھے پیچھے بھاگا

یہ وہی کملا چرن ہے جو مالی کو انعام و اکرام دیا کرتا تھا اور جس سے مالی سرکار اور حضور کہہ کر باتیں کیا کرتا تھا۔ وہ کملا اسی مالی کے سامنے اس طرح جان بچا کر بھاگا جاتا ہے۔

گناہ آگ کا وہ کنڈ ہے جو عزت و حرمت، حوصلہ و ہمت کو چشم زدن میں جلا کر راکھ کر دیتا ہے۔

کملا چرن درختوں اور جھاڑیوں کی آڑ میں دوڑتا ہوا پھاٹک سے باہر نکلا، سڑک پر

ٹرام جا رہی تھی۔ اس پر جا بیٹھا اور ہانپتے ہانپتے بیدم ہو کر گاڑی کے تختہ پر بدحواس ہر کر گر پڑا، اگرچہ مالی نے پھاٹک تک بھی پیچھا نہ کیا۔ مگر کملا ہر ایک آنے جانے والے پر چونک کر نگاہیں ڈالتا گویا سارا زمانہ اس کا دشمن ہو گیا مگر ٹکٹ لینے کی سدھ نہ رہی اور نہ یہ معلوم ہوا کہ میں کدھر جا رہا ہوں۔ وہ اس وقت اس شہر سے بھاگنا چاہتا ہے۔ خواہ کہیں بھی، کچھ دور چلا کہ ایک انگریز ریلوے افسر لالٹین لیے آتا دکھائی دیا۔ اس کے ساتھ ایک کانسٹیبل تھا۔ وہ مسافروں کا ٹکٹ دیکھتا چلا آتا تھا مگر کملا نے سمجھا کہ کوئی پولیس کا افسر ہے، خوف کے مارے ہاتھ پاؤں سنسنانے لگے۔ اور کلیجہ میں دھڑکن ہونے لگی۔ جب تک وہ دوسری گاڑیوں میں معائنہ کرتا رہا تب تک وہ کلیجہ مضبوط کیے بیٹھا رہا۔ مگر جوں ہی اس کے کمرہ کا دروازہ کھلا کملا نے سمجھا کہ کوئی پولیس کا افسر ہے، خوف کے مارے ہاتھ پاؤں سنسنانے لگے۔ اور کلیجہ میں دھڑکن ہونے لگی جب تک وہ دوسری گاڑیوں میں معائنہ کرتا رہا تب تک وہ کلیجہ مضبوط کیے بیٹھا رہا۔ مگر جوں ہی اس کے کمرہ کا دروازہ کھلا کملا کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ ایک وحشت کے عالم میں دوسری طرف کا دروازہ کھول کر چلتی ریل سے یوں نیچے کود پڑا۔ کانسٹیبل اور ٹکٹ والے صاحب نے اسے یوں کودتے دیکھا تو سمجھے کوئی مشاق ڈاکو ہے۔ مارے خوشی کے پھولے نہ سمائے کہ انعام الگ ملے گا اور ترقی اوپر سے ہوگی، فوراً سرخ لالٹین دکھائی ذرا دیر میں گاڑی رک گئی۔

اب گارڈ اور کانسٹیبل اور ٹکٹ والے صاحب چند دوسرے آدمیوں کے ساتھ گاڑی سے نیچے اتر پڑے۔ اور لالٹین لے کر ادھر ادھر تلاش کرنے لگے۔ کسی نے کہا، اب اس کی گرد بھی نہیں ملے گی۔ پکا ڈکیت تھا۔

کوئی بولا ان لوگوں کو کالی جی کا ایشٹ رہتا ہے مگر گارڈ آگے ہی بڑھتا گیا۔ ترقی کی امید اسے آگے لیے جاتی تھی۔ یہاں تک کہ وہ اس مقام پر آ پہنچا۔ جہاں کملا

چرن گاڑی سے کودا تھا۔

اتنے میں کانسٹیبل نے خندق کی طرف اشارہ کر کے کہا ''دیکھو وہ سفید سفید کیا چیز ہے؟ مجھے تو کوئی آدمی معلوم ہوتا ہے'' اور لوگوں نے بھی دیکھا اور یقین ہو گیا کہ ضرور بدمعاش یہیں چھپا ہوا ہے ''چل کر بچو کو گھیر لو کہ کہیں نکلنے نہ پاوے''

''ذرا سنبھلتے ہوئے رہنا۔ ڈاکو جان پر کھیل جاتے ہیں''

گارڈ صاحب نے پستول سنبھالا۔ میاں کانسٹیبل نے لاٹھی تانی، چند مسافروں نے جوتے اتار کر ہاتھوں میں لے لیے کہ کہیں وار کر بیٹھا تو بھاگنے میں آسانی ہو گی۔ دو چار آدمیوں نے ڈھیلے اٹھا لیے کہ دور ہی سے نشانہ لگائیں گے۔ ڈاکو کے نزدیک کون جائے؟ کسے جان بھاری پڑی ہے؟

مگر جب لوگوں نے نزدیک جا کر دیکھا تو نہ ڈاکو نہ ڈاکو کا بھائی بلکہ ایک شریف صورت زادہ، سبزہ آغاز، چھریرے بدن کا نوجوان، بے حس و حرکت زمین پر اوندھے منہ پڑا ہے اور اس کی ناک اور کان سے آہستہ آہستہ خون بہہ رہا ہے۔ برجن کا لال ہر جودیئی نے چھین کر زمین پر پٹک دیا تھا۔

کملا چرن نے ادھر دم توڑا اور برجن ایک بھیانک خواب دیکھ کر چونک پڑی۔ سوجودیئی نے برجن کا سہاگ لوٹ لیا۔ شراب محبت کا دور ایسا نہ ہوا کہ نہ ساقی رہا نہ ساغر سب خام میں مل گئے۔

19

ہجوم غم

سہاگن عورت کے لیے اس کا شوہر دنیا کی سب سے پیاری چیز ہوتی ہے، وہ اسی کے لیے جیتی ہے اور اسی کے لیے مرتی ہے، اس کا ہنسنا بولنا، اسی کو خوش کرنے کے لیے، اور اس کا بناؤ سنگھار اسی کے لبھانے کے لیے ہوتا ہے، اس کا سہاگ اس کی مسرت اور زندگی ہے اور سہاگ کا اٹھ جانا اس کی زندگی اور جانداری کا خاتمہ ہے۔

کملا چرن کی بے ہنگم موت برج رانی کے لیے موت سے کم نہ تھی۔ اس کی زندگی کی آرزوئیں اور ولولے سب مٹی میں مل گئے کیا کیا ارادے تھے اور کیا ہو گیا۔ ہر دم مرنے والی صورت اس کی آنکھوں میں پھرا کرتی تھی۔ اگر ذرا دیر کے لیے آنکھیں جھپک جاتیں تو اس کی تصویر ہو بہو آنکھوں کے سامنے آ جاتی۔

بعض اوقات آفات ارضی و سماوی کو کسی خاص شخص یا خاندان سے انس سا ہو جاتا ہے۔ کملا چرن کا داغ مرجھانے بھی نہ پایا تھا کہ بابو شیاما چرن کی باری آ گئی۔ شاخوں کے کاٹنے سے درخت کو مرجھاتے دیکھ کر اب کی آسمان نے جڑ ہی کاٹ دی۔ رام دین پانڈے بڑا کینہ پرور شخص تھا۔ جب تک ڈپٹی صاحب مجگاؤں میں تھے دبکا بیٹھا تھا۔ مگر جونہی وہ شہر کو لوٹے اس نے اودھم مچانا شروع کر دیا۔ سارا گاؤں کا گاؤں اس کا دشمن تھا۔ جن نگاہوں نے مجگاؤں والوں نے ہولی کے دن اس کی طرف دیکھا تھا وہ نگاہیں اور تیور اس کے کلیجہ میں کانٹے کی طرح کھٹک رہے تھے۔ جس حلقہ میں مجگاؤں واقع تھا اس کے تھانیدار صاحب ایک بڑے گھاگ آزمودہ کار راشی تھے۔ ہزاروں کی رقمیں ہضم کر جائیں مگر ڈکار تک نہ لیں۔ مقدمے بنانے اور ثبوت بہم پہنچانے میں ایسے مشاق تھے کہ راہ چلتے آدمی کو پھانس لیں۔ اور پھر کسی کے چھڑائے نہ چھوٹے۔ حکام ان کے سب ہتھکنڈوں سے واقف تھے۔ مگر ان کی ہشیاری اور معاملہ دانی کے مقابلہ میں کسی کا کچھ بس نہ چلتا تھا۔ رام دین تھانیدار صاحب سے ملا اور اپنے زخم جگر کی دوا مانگی۔ اس کے ہفتہ بھر بعد مجگاؤں میں ڈاکہ پڑا۔ ایک مہاجن شہر سے آ رہا تھا نمبردار کے ہاں رات کو ٹھہرا۔ ڈاکوؤں نے اسے لوٹ کر گھر نہ جانے دیا۔ صبح کو تھانیدار صاحب تحقیقات کو آئے اور ایک ہی رسی میں سارے گاؤں کو باندھ لے گئے۔

حسن اتفاق سے مقدمہ بابو شیاما چرن کے اجلاس میں پیش ہوا۔ انہیں پہلے ہی سے سارا کچا چٹھا معلوم تھا اور یہ تھانیدار صاحب بہت دنوں سے ان کی آنکھوں پر

چڑھے ہوئے تھے۔ انہوں نے ایسی ایسی موشگافیاں کیں اور ایسے ایسے نکتے نکالے کہ تھانیدار صاحب کی قلعی کھل گئی۔ چھ مہینہ تک مقدمہ چلا اور دھوم دھام سے چلا۔ سرکاری وکیلوں نے بڑے بڑے زور لگائے مگر گھر کے بھیدی سے کیا چھپ سکتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ڈپٹی صاحب نے سب ملزموں کو رہا کر دیا اور اسی دن شام کو تھانیدار صاحب معطل کر دیئے گئے۔

جب ڈپٹی صاحب فیصلہ سنا کر لوٹے تو ایک ہمدرد اہلکار نے کہا حضور تھانیدار صاحب سے ذرا ہوشیار رہیے گا۔ آج بہت جھلایا ہوا تھا۔ پہلے بھی دو تین افسروں کو زک پہنچا چکا ہے، آپ پر بھی ضرور وار کرے گا۔ ڈپٹی صاحب نے سنا اور مسکرا کر اس کا شکریہ ادا کیا مگر اپنی حفاظت کے لیے مزید انتظام نہ کیا۔ انہیں یہ خیال بزدلانہ معلوم ہوتا تھا رادھا ہیر بہت ضد کرتا رہا کہ میں آپ کے ساتھ رہوں۔ کاشی بھر بھی بہت پیچھے پڑا رہا مگر انہوں نے کسی کو ساتھ نہ رکھا اور حسب معمول اپنا فرض انجام دیتے رہے۔

ظالم خاں بات کا دھنی تھا۔ وہ زندگی سے ہاتھ دھو کر بابو شیاما چرن کے پیچھے پڑ گیا۔ ایک روز وہ شیاما چرن سیر کر کے شیو پور سے کچھ رات گئے واپس آ رہے تھے کہ پاگل خانہ کے قریب کچھ فٹن کا گھوڑا دبکا اور دم زدن میں ظالم خاں نے ایک درخت کی آڑ سے نکل کر پستول کا نشانہ لگایا۔ پٹاخے کی آواز ہوئی اور بابو شیاما چرن کے سینہ سے گولی پار ہو گئی۔ پاگل خانہ کے گارڈ کے سپاہی دوڑے اور ظالم خاں کو گرفتار کر لیا۔ سائیس نے اسے بھاگنے نہ دیا۔

اس حادثہ نے خاندان کی تباہی کا سامان پورا کر دیا۔ پریم وتی یوں تو بہت نیک مزاج اور مجتبیٰ عورت تھی مگر ان حادثات نے اس کے مزاج اور برتاؤ میں یکا یک بڑی تبدیلی پیدا کر دی۔ اس کے حواس میں فرق آ گیا۔ بات بات پر برجن سے چڑ جاتی اور طعنے مارنے لگتی۔ اسے خدا جانے کیونکر وہم ہو گیا تھا کہ یہ سب آفت اسی بہو کی

لائی ہوئی ہے۔ یہی سبز قدم جب سے گھر میں آئی ہے گھر ستیاناس ہو گیا۔ اس کا پودا خراب ہے۔ کئی دفعہ اس نے برجن سے کھول کر کہہ دیا تھا کہ تمہاری چکنی چپڑی صورت نے مجھے موہ لیا تھا۔ میں کیا جانتی تھی کہ تمہارے چرن ایسے منحوس ہیں۔

برجن یہ باتیں سنتی اور کلیجہ مسل کر رہ جاتی۔ جب دن ہی برے آ گئے تو بھلی باتیں کیونکر سننے میں آئیں۔ یہ آٹھوں پہر کی کوفت اسے حسرت کے آنسو بھی بہانے نہ دیتی۔ آنسو نکلتے ہیں جب کوئی ہمدرد ہو۔ اور دلسوزی کرے کوفت اور لعن طعن کی آگ سے آنسو خشک ہو جاتے ہیں۔

ایک روز برجن کا جی گھر بیٹھے بیٹھے ایسا گھبرایا کہ وہ ذرا دیر کے لیے باغیچہ میں چلی گئی۔ آہ اس باغیچہ میں کیسے کیسے لطف کے دن گزارے تھے۔ اس کا ایک ایک پودا مرنے والے کی محبت بیکراں کی یادگار تھا۔ کبھی وہ دن بھی تھے کہ ان پھولوں اور پتیوں کو دیکھ کر دل باغ باغ ہو جاتا تھا اور نسیم دل پر زخموں کا نشہ پیدا کر دیا کرتی تھی۔ یہی مقام ہے جہاں بہت سی شامیں آغوش محبت میں گزری تھیں، اور شراب محبت کے دور چلے تھے، اس وقت پھولوں کی نازک نازک پنکھڑیاں نازک نازک ہونٹوں کا خیر مقدم کرتی تھیں۔ مگر افسوس آج ان کے سر جھکے ہوئے تھے اور زبان بند تھی۔ کیا یہ وہ جگہ نہ تھی جہاں البیلی مالن پھولوں کا مار گوندھتی تھی مگر بھولی مالن کو کیا معلومت تھا کہ اسی جگہ اسے اپنی آنکھوں سے نکلے ہوئے موتیوں کے ہار گوندھنے پڑیں گے۔ انہیں خیالوں میں برجن کی نگاہیں اس کنج کی طرف اٹھ گئیں، جہاں سے ایک بار کملا چرن مسکراتا ہوا نکلا تھا۔ گویا وہ پتیوں کی جنبش اور اس کے کپڑوں کی جھلک دیکھ رہی ہے۔ اس کے چہرے پر اس وقت ہلکی سی مسکراہٹ نمودار تھی جیسے گنگا میں ڈوبتے ہوئے آفتاب کی زرد اور مہین کرنوں کا عکس پڑتا ہے۔ یکا یک پریم وتی نے آ کر کرخت آواز میں کہا۔

''ابھی آپ کو سیر کرنے کا شوق چرایا ہے؟''

برجن کھڑی ہوگئی اور روتی ہوئی بولی ''اماں جسے نارائن نے کچلا اسے آپ کیا کچلتی ہیں؟''

آخر پریم وتی شہر سے ایسی بیزار ہوئی کہ ایک مہینہ کے اندر سب سامان اونے پونے بیچ کر مجگاؤں چلی گئی۔ برج رانی کو ساتھ نہ لیا۔ اس کی صورت سے اسے نفرت ہوگئی تھی۔ برجن اس مکان میں اکیلی رہ گئی۔

مادھوی کے سوا اب اس کا کوئی غم خوار نہ تھا۔ سہاما کو اپنی منہ بولی بیٹی کی مصیبتوں کا اتنا ہی صدمہ ہوا جتنا اپنی بیٹی کا ہوتا۔ کئی دن تک روتی رہی اور کئی دن برابر سمجھانے کے لیے آتی رہی۔ جب برجن اکیلی رہ گئی تو سہاما نے چاہا کہ یہ میرے یہاں اٹھ آئے اور آرام سے رہے۔ خود کئی بار بلانے گئی۔ مستری جی کو بھیجا مگر برجن کسی طرح آنے پر آمادہ نہ ہوئی۔ اسے خیال ہوتا تھا کہ ان کے مرتے ہی ساس اور بہولڑ مریں۔ یہاں تک کہ سہاما کا من اس کی ضد سے موٹا ہوگیا۔

مجگاؤں میں پریم وتی نے ایک اندھیر مچا رکھا تھا۔ اسامیوں کو سخت سست کہتی۔ کارندے کے سر پر جوتی پٹک دی، پٹواری کو کوسا۔ رادھرا ہیر کی گائے زبردستی چھین لی۔ یہاں تک کہ گاؤں والے گھبرا گئے اور بابو رادھا چرن سے شکایت کی۔ رادھا چرن نے یہ کیفیت سنی تو یقین ہوگیا کہ ضرور ان صدمات نے اس کے حواس زائل کر دیئے ہیں۔ اس وقت کسی طرح ان کا دل بہلانا چاہیے۔ سیوتی کو لکھا کہ تم اماں کے پاس چلی آؤ اور اس کے ساتھ کچھ دن رہو۔ سیوتی کی گود میں اس وقت ایک چاند سا بچہ کھیل رہا تھا اور پران ناتھ دو مہینہ کی رخصت لے کر دربھنگہ سے لوٹے تھے۔ راجہ صاحب کے پرائیویٹ سیکرٹری ہوگئے تھے ایسے موقع پر سیوتی کیونکر آسکتی تھی۔

تیاریاں کرتے کرتے مہینوں گزر گئے، کبھی لڑکا بیمار پڑ گیا کبھی ساس روٹھ گئی۔ کبھی ساعت نہ بنی۔ آخر چھٹویں مہینہ جا کر اسے فرصت ملی اور وہ بھی بڑی منتوں کے ساتھ۔

مگر پریم وتی پر اس کے آنے کا مطلق اثر نہ ہوا، وہ اس کے گلے مل کر بھی نہ روئی۔ اس کے بچے کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھا۔ اس کے دل میں اب محبت اور انسانیت نام کو بھی باقی نہ رہی تھی۔ جیسے گنے سے رس نکال کر صرف فضلہ باقی رہ جاتا ہے اسی طرح جس انسان کے دل سے محبت نکل گئی، وہ گوشت پوست کا ایک تودہ رہ گیا۔ دیوی دیوتا کا نام زبان پر آتے ہی اس کے تیور بدل جاتے تھے۔ مجگاؤں میں جنم اشٹمی ہوئی، لوگ ٹھاکر جی کا برت رکھے ہوئے تھے اور چندہ سے ناچ کرنے کی تیاریاں ہو رہی تھیں مگر پریم وتی نے عین جنم کے موقع پر اپنے گھر کی مورتی کھیت میں پھنکوا دی۔ ایکادشی برت چھوٹا، دیوتاؤں کی پوجا چھوٹی، وہ پریم وتی ہی نہ تھی۔

سیوتی نے جوں توں کر کے یہاں دو مہینہ کاٹے۔ اس کی طبیعت بہت گھبراتی۔ کوئی سکھی سہیلی بھی نہ تھی جس کے ساتھ بیٹھ کر دن کاٹتی۔ برجن نے تلسا کو اپنی سکھی بنا لیا تھا۔ مگر سیوتی کا مزاج امیرانہ واقع ہوا تھا۔ ایسی عورت سے میل جول وہ اپنے لیے باعث ننگ سمجھتی تھی۔ تلسا بیچاری کئی بار آئی۔ مگر جب دیکھا کہ یہ دل کھول کر نہیں ملتی تو آنا جانا چھوڑ دیا۔

تین مہینہ گزر چکے تھے ایک روز سیوتی دن چڑھے تک سوتی رہی۔ پر ان ناتھ نے رات کو بہت رلایا تھا۔ جب نیند کھلی تو کیا دیکھتی ہے کہ پریم وتی اس کے بچے کو گود میں لیے چوم رہی ہے۔ کبھی آنکھوں سے لگاتی ہے اور کبھی چھاتی سے چمٹاتی۔ سامنے انگیٹھی پر ہپا پک رہا تھا۔ بچہ اس کی طرف اشارہ کر کے اچکتا ہے کہ کٹورے میں جا بیٹھوں اور گرم گرم حلوہ چکھوں۔ آج اس کا چہرہ کنول کی طرح کھلا ہوا تھا۔ شاید اس نے تاڑ لیا ہے کہ پریم وتی کے اجڑے ہوئے دل میں پریم نے آج پھر باس کیا ہے۔ سیوتی کو یقین نہ آیا چارپائی پر پڑے نیم باز آنکھوں سے تاک رہی تھی۔ گویا خواب دیکھ رہی ہے۔ اتنے میں پریم وتی پیار سے بولی۔

''بیٹی اٹھو دن چڑھ آیا''

سیوتی کے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور آنکھیں بھر آئیں۔ آج بہت دنوں کے بعد ماں کے منہ سے محبت کی باتیں سنیں۔ جھٹ اٹھ بیٹھی اور ماں کے گلے لپٹ کر رونے لگی۔ پریم وتی کی آنکھوں سے بھی آنسو کی جھڑیاں لگ گئیں۔ سوکھا پیڑ ہرا ہوا۔ جب دونوں کے آنسو تھمے تو پریم وتی بولی۔

''تمہیں آج یہ سب باتیں اچرج معلوم ہوتی ہے۔ ہاں بیٹی اب اچرج ہی ہیں۔ میں کیسے روؤں۔ جب آنکھوں میں آنسو ہی نہیں رہے۔ پیار کہاں سے لاؤں، جب کلیجہ سوکھ کر پتھر ہو گیا۔ یہ سب دنوں کے پھیر ہیں۔ آنسو ان کے ساتھ اور پیار کملا کے ساتھ۔ آج نہ جانے یہ دو بوند کہاں سے نکل آئے۔ بیٹی میری سب خطائیں معاف کرنا''

یہ کہتے کہتے اس کی آنکھیں جھپکنے لگیں۔ سیوتی زرد ہو گئی۔ ماں کو فرش پر لٹا دیا۔ اس دن سے پریم وتی کا یہ حال ہو گیا جب دیکھو رو رہی ہے۔ باتیں کرتی تو شکر قند گھول دیتی۔ بچے کو گود سے ایک دم کے لیے الگ نہ کرتی۔ مہریوں سے بولتی تو منہ سے پھول جھڑتے۔ پھر پہلے کی جیسی پریم وتی ہو گئی۔ شیریں زبان، رحم دل اور نیک، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کے دل سے ایک پردہ سا اٹھ گیا۔ جب شدت کی برف پڑتی ہے تو بعض ندیاں یخ بستہ ہو جاتی ہیں۔ تب ان میں بسنے والی مچھلیاں اور دریائی جانور چادر برف میں چھپ جاتے ہیں۔ کشتیاں پھنس جاتی ہیں اور اس خوش خرام سیمیں جاں نواز چشمہ آب کی صورت بالکل نظر نہیں آتی۔ حالانکہ برف کی چادر کے نیچے وہ خواب ناز میں مست پڑا رہتا ہے۔ مگر جب گرمی کا راج ہوتا ہے تو برف پگھل جاتی ہے اور دریائے سیم تن برف کی چادر اٹھا دیتا ہے۔ پھر مچھلیاں اور جانور آ بستے ہیں۔ کشتیوں کے بادبان لہرانے لگتے ہیں اور اس کے ساحل پر مردم و مرغ و مور کا جمگھٹ ہو جاتا ہے۔

مگر یہ کیفیت زیادہ دنوں تک قائم نہ رہی۔ ایک ہی ہفتہ میں پریم وتی کی حالت

نازک ہوگئی۔مزاج کا صحیح ہونا گویا موت کا پروانہ تھا۔اسی مدہوشی نے اسے اب تک قید حیات میں رکھا تھا۔ورنہ پریم وتی جیسی نرم دل عورت باعث حوادث کے ایسے جھونکے نہ برداشت کرسکتی تھی۔

سیوتی نے چاروں طرف تار ڈلوائے کہ آکر اماں کو دیکھ جاؤ مگر کہیں سے کوئی نہ آیا۔پران ناتھ کو رخصت نہ ملی۔برجن بیمار تھی۔رہے رادھا چرن وہ نینی تال سیر کرنے گئے تھے۔پریم وتی کو بیٹے کے دیدار کا شوق تھا۔مگر جب ان کا خط آگیا کہ میں اس وقت نہیں آسکتا تو اس نے آکر ایک لمبی سانس لی اور آنکھیں موندلیں اور ایسی سوئی کہ پھر اٹھنا نصیب نہ ہوا۔

20

نفس کی سرکشیاں

انسان کا دل ایک راز سربستہ ہے،کبھی تو وہ لاکھوں کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتا اور کبھی چند پیسوں پر پھسل جاتا ہے۔کبھی صدہا بے گناہوں کے خون پر اف تک نہیں کرتا اور کبھی ایک بچے کو روتا دیکھ کر رو دیتا ہے۔

پرتاپ چند اور کملاچرن میں اگرچہ برادرانہ محبت تھی مگر کملا کی بے ہنگام موت پر جو صدمہ پرتاپ چند کو ہونا چاہیے تھا وہ نہ ہوا۔سن کر وہ چونک ضرور پڑا اور ذرا دیر کے لیے مغموم بھی نظر آیا مگر وہ ملال جو کسی شخص کو اپنے سچے دوست کی وفات پر ہوتا ہے اسے نہ ہوا۔اس میں شک نہیں کہ شادی سے پہلے اس نے برجن کو اپنی بہن سمجھنا شروع کیا تھا۔تاہم اس خیال میں اسے پوری کامیابی نہ حاصل ہوئی۔وقتاً فوقتاً اس کا وہم اس پاک رشتہ کے حدود سے بہت آگے بڑھ جاتا تھا۔کملاچرن سے اسے بذات خاص کوئی ایسی محبت نہ تھی۔اس کی جو خاطر و مدارات اور محبت وہ کرتا تھا۔وہ کچھ تو اس خیال سے کہ برجن سن کر خوش ہوگی،اور کچھ اس خیال سے کہ سوشیلا کی موت کا کفارہ اسی طرح ادا ہوسکتا ہے۔جب برجن سسرال چلی آئی تو البتہ کچھ دنوں

تک پرتاپ نے اسے اپنے خیالات میں نہ آنے دیا۔ مگر جس وقت سے وہ اس کی بیماری کی خبر پا کر بنارس گیا تھا اور اس کی ملاقات نے برجن پر داروئے شفا کا کام کیا تھا۔ اسی وقت سے پرتاپ کو یقین ہو گیا تھا۔ کہ برجن کے دل میں کملا نے وہ جگہ نہیں پائی جو میرے لیے مخصوص تھی۔

پرتاپ نے برجن کو نہایت پر درد ماتم نامہ لکھا۔ مگر خط لکھتا جاتا تھا کہ اس کا اس پر کیا اثر ہوگا۔ بالعموم ہمدردی محبت کو مضبوط کرتی ہے کیا عجب کہ یہ خط ہی اپنا کام کر جائے۔ علاوہ اس کے چونکہ وہ ذرا مذہبیت کی طرف زیادہ مائل تھا۔ کملا چرن کی موت نے یہ خیال پیدا کیا کہ ایشور نے میری محبت کی قدر کی اور کملا چرن کو میرے راستے سے ہٹایا۔ گویا یہ غیب سے پروانہ ملا ہے کہ اب میں برجن سے اپنی محبت کی دادلوں۔ پرتاپ یوں سمجھتا تو تھا کہ برجن سے کسی ایسی بات کی امید کرنا جو اخلاق اور صداقت کے راستہ سے جو بھر بھی ہٹی ہوئی ہو، حماقت ہے۔ مگر اخلاق اور صداقت کے دائرے میں رہتے ہوئے میری خاطر داری اور دلداری اگر ممکن ہے تو برجن زیادہ عرصہ تک میرے ساتھ بے رحمی نہیں کر سکتی۔ جب میں آنکھوں میں آنسو بھر کر اور عاجزی سے منت کروں گا تو وہ ضرور میری طرف مخاطب ہو جائے گی۔ اور وقت، محبت اور عاشقانہ خاطر داریاں اپنا اپنا کام پورا کر کے رہیں گی۔

ایک مہینہ تک یہ خیالات اسے بے چین کرتے رہے، یہاں تک کہ برجن سے ایک بار پوشیدہ ملاقات کرنے کا بیتابانہ اشتیاق پیدا ہوا۔ یہ وہ جانتا تھا کہ ابھی برجن کے دل پر تازہ صدمہ ہے اور میری بات یا انداز سے اگر میرے نفس کی سرکشیوں کی بو نکلی تو برجن کی نگاہوں سے ہمیشہ کے لیے گر جاؤں گا۔ مگر جیسے کوئی چور روپیہ کا ڈھیر لگا کر دیکھ کر صبر نہیں کر سکتا، اسی طرح پرتاپ اس وقت اپنے تئیں تھام نہ سکا۔ انسان کی قسمت بڑی حد تک موقعوں کے ہاتھ میں رہتی ہے۔ مواقع اسے نیک بھی بناتے ہیں اور بد بھی، جب تک کملا چرن زندہ تھا، پرتاپ کے نفس کو کبھی اتنا سر

ابھارنے کا موقع نہ ملا۔ اس کی موت نے گویا جگہ خالی کر دی۔

یہ خودغرضی کا نشہ یہاں تک بڑھا کہ اسے ایک روز ایسا محسوس ہوا کہ برجن مجھے یاد کر رہی ہے۔ اپنی بیتابی سے وہ برجن کی بیتابی کا اندازہ لگانے لگا اور بنارس جانے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ دو بجے رات کا وقت تھا چاروں طرف موت کا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ نیند نے سارے شہر پر ایک گھٹا ٹوپ چادر پھیلا دی تھی۔ کبھی کبھی پیڑوں کی سنسناہٹ سنائی دے جاتی تھی۔ دھواں مکانوں اور درختوں پر ایک سیاہ غلاف کی طرح لپٹا ہوا تھا اور سڑک کی لالٹینیں دھوئیں کی سیاہی میں ایسی نظر آتی تھیں، جیسے بادل میں چھپے ہوئے تارے۔

پرتاپ چند ریل گاڑی سے اترا تو اس کا دل بانسوں اچھل رہا تھا اور ہاتھ پاؤں کانپتے تھے۔ یہ زندگی میں پہلا موقع تھا کہ گناہ کا اسے تجربہ ہوا۔ افسوس کہ دل کی یہ کیفیت عرصے تک قائم نہیں رہتی۔

نفس اس منزل دشوار کو طے کر لیتا ہے جس نے کبھی شراب نہیں پی اسے شراب کی بو سے نفرت ہے۔ شاید پہلی بار وہ پیئے گا تو گھنٹوں اس کا منہ بدمزہ رہے گا اور تعجب کرے گا کہ کیوں لوگ اس زہریلی اور کڑوی چیز کے گرویدہ ہیں۔ مگر چند ہی دنوں میں اس کی نفرت غائب ہو جاتی ہے اور وہ بھی آب سرخ کا غلام ہو جاتا ہے۔ گناہ کا مزہ شراب سے بہت زیادہ ہوتا ہے۔

پرتاپ چند اندھیرے میں آہستہ آہستہ جا رہا تھا۔ اس کے قدم جلد جلد نہیں اٹھتے تھے۔ کیونکہ گناہ نے اس کے پیروں میں بیڑیاں ڈال دی تھیں اس ولولہ مسرت کا جو ایسے موقعوں پر قدموں کو تیز کر دیتی ہے۔

پرتاپ کا سر دھم دھم کر رہا تھا اور خوف سے پنڈلیاں کانپ رہی تھیں۔ سوچتا بچارتا گھنٹہ بھر میں وہ منشی شیاما چرن کی شاندار حویلی کے سامنے جا پہنچا۔

آج تاریکی میں یہ حویلی بہت ہی بھیانک معلوم ہو رہی تھی، جیسے گناہ کا بھوت

سامنے کھڑا ہو۔ پرتاپ دیوار کی آر میں کھڑا ہو گیا۔ کسی نے اس کے پیر باندھ دیئے۔ آدھ گھنٹہ وہ یہی سوچتا رہا کہ لوٹ چلوں یا اندر چلوں اگر کسی نے دیکھ لیا تو غضب ہو جائے گا۔ برجن مجھے دیکھ کر کیا سوچے گی؟ کہیں ایسا نہ ہو کہ میری یہ حرکت مجھے ہمیشہ کے لیے اس کی نظروں سے گرا دے۔ مگر ان سب اندیشوں پر شیطان کی کشش غالب آئی۔

نفس کے بس میں ہو کر انسان کی نیک و بد کی تمیز باقی نہیں رہ جاتی۔ اس نے دل کو مضبوط کیا اور اس بزدلی پر اپنے تئیں ملامت کرنے لگا۔

بعد ازاں مکان کے عقب کی طرف جا کر باغیچہ کی چار دیواری سے اندر پھاند پڑا۔ باغیچہ سے مکان کے اندر جانے کے لیے ایک چھوٹا سا دروازہ تھا۔ اتفاق سے وہ اس وقت کھلا تھا۔ پرتاپ کو اس وقت یہ ایک نیک فال سا معلوم ہوا مگر فی الواقع یہ خانہ مصیبت کا دروازہ تھا۔ اندر جاتے وقت پرتاپ کے ہاتھ پاؤں تھرتھرانے لگے۔ دل میں ایسی غضب کی دھڑکن تھی معلوم ہوتا تھا وہ سینہ سے باہر نکل پڑے گا اس کا دم گھٹتا تھا۔ ایمان نے اب کی بہت زور لگایا۔ اپنی ساری قوت صرف کر دی مگر نفس کا پر زور دھارا رک نہ سکا۔

پرتاپ دروازے کے اندر داخل ہوا، اور آنگن میں تلسی کے چبوترے کے پاس چوروں کی طرح کھڑا سوچتا رہا کہ برجن سے کیونکر ملاقات ہو۔ مکان کے سب دروازے بند ہیں کیا برجن بھی یہاں سے چلی گئی؟

یکا یک اسے بند دروازے کی دراڑوں سے ہلکی سی روشنی کی شعاع دکھائی دی۔ اسے دیکھتے ہی اس کے جگر نے ایسی قلانچ بھری گویا ہوا میں اڑ جائے گا۔ دبے پاؤں اسی طرف چلا اور دراڑ میں آنکھ لگا کر اندر کی کیفیت دیکھنے لگا۔ اس کی سانس اس وقت بڑی تیزی سے چل رہی تھی۔

برجن ایک سفید ساڑھی پہنے چہرہ زرد، بال بکھرے ہوئے فرش پر ہاتھ میں قلم

لیے بیٹھی تھی اور دیوار کی طرف دیکھ دیکھ کر کاغذ پر کچھ لکھتی جاتی تھی جیسے کوئی شاعر بحر خیال سے موتی نکال رہا ہو۔ قلم کو دانتوں تلے دبا کر کچھ سوچتی اور لکھتی اور ذرا دیر کے بعد دیوار کی طرف تاکنے لگتی۔

پرتاپ بہت دیر تک سانس روکے ہوئے یہ دلچسپ نظارہ دیکھتا رہا۔ نفس اسے بار بار ٹھوکے دیتا مگر یہ ایمان کا آخری قلعہ تھا۔ اس وقت ایمان شکست کھا جانا گویا پہلوئے دل میں شیطان کا جگہ پانا تھا۔ ایمان اور نتائج کے خوف نے اس وقت پرتاپ کو اس غار میں گرنے سے بچالیا جہاں سے مرتے دم تک اسے نکلنا نصیب نہ ہوتا۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہے کہ غار معصیت سے بچانے والا اس وقت ایمان نہ تھا بلکہ نتائج کے خوف اور پشیمانی کا خیال تھا۔ بسا اوقات جب ہمارا ایمان مغلوب ہو جاتا ہے تو نتائج کا خوف ہم کو بدکرداریوں سے بچالیتا ہے۔ برجن کے چہرے پر باوجود زردی کے ایک ایسی رونق تھی جو قلب کی صفائی اور خیال کی بلندی کا پتہ دے رہی تھی۔ اس کے بشرے کی متانت اور نگاہ کی بلندی کا پتہ دے رہی تھی۔

پاکیزگی میں نفس سرکش کے لیے وہ جاں گداز تازیانہ تھا۔ جس سے پرتاپ کے نفس کا جانبر ہونا محال تھا۔ کیونکہ وہ راہ معصیت میں اس کا یہ پہلا سفر تھا۔ وہ ایسا موثر ہوا کہ رونے لگا۔ نفس کے جتنے خیالات فاسد اس کے دل میں پیدا کر دیئے تھے وہ سب اس نظارے نے یوں غائب کر دیئے جیسے اجالا اندھیرے کو دور کر دیتا ہے۔ اس وقت اسے یہ خواہش ہوئی کہ اس کے پیروں پر گر کر اپنی ان خطاؤں کی معافی مانگ لوں۔

جیسے کسی مہاتما سنایسی کے روبرو جا کر ہمارے دل کی کیفیت ہو جاتی ہے اسی طرح پرتاپ کے دل میں خود بخود اعزاز و احترام کے خیالات پیدا ہوئے۔ وہ اپنی اخلاقی پستی پر ایسا نادم ہوا کہ برجن کے سامنے جانے کی ہمت نہ پڑی۔ شیطان یہاں تک لایا مگر آگے نہ لے جا سکا۔ وہ الٹے قدم لوٹا اور ایسی تیزی سے باغیچہ میں آیا اور چار

دیواری سے باہر کود گویا کوئی اس کے تعاقب میں ہے۔

صبح کاذب کا وقت ہو گیا۔ پرتاپ کے ایمان کی طرح آسمان میں تارے جھلملا رہے تھے، اور چکی کی گھر گھر آواز کانوں میں آتی تھی۔

پرتاپ پیر دباتا ہوا آدمیوں کی نظریں بچاتا گنگا جی کی طرف چلا۔ یکا یک اس نے سر پر ہاتھ رکھا تو ٹوپی کا پتہ نہ تھا اور نہ جیب میں گھڑی دکھائی دی۔ اس کا کلیجہ سن سا ہو گیا اور دل سے بے اختیار ایک آہ نکلی

بعض اوقات ہماری زندگی میں ایسے واقعات ہو جاتے ہیں جو دم زدن میں اس کی صورت پلٹ دیتے ہیں۔ کبھی والدین کی ایک ترچھی نگاہ بیٹے کو نیک نامی کے ساتویں آسمان پر پہنچا دیتی ہے اور کبھی بیوی کی ایک نصیحت شوہر کو مہاتما رشی بنا دیتی ہے۔ غیرت مند ہستیاں اپنے یگانوں کی نگاہوں میں ذلیل ہو کر دنیا کا بوجھ بننا نہیں برداشت کر سکتیں۔ انسانی زندگی میں ایسے مواقع خداداد ہوتے ہیں۔ پرتاپ چند کی زندگی میں بھی وہ مبارک وقت تھا، جب وہ پیچدار گلیوں میں ہوتا ہوا گنگا کے کنارے آ کر بیٹھا اور افسوس و ندامت کے آنسو بہانے لگا۔ نفس کی حوصلہ افزائیوں نے اسے ذلیل و خوار کرنے میں کوئی کسر نہ رکھی تھی۔ مگر اس کے لیے یہ تازیانہ استاد مہربان کا تازیانہ ثابت ہوا۔ کہ یہ تجربہ نہیں کہ زہر بھی بعض اوقات آب حیات کا کام دیتا ہے۔

جس طرح ہوا کا جھونکا سلگتی ہوئی آگ کو دہکا دیتا ہے اسی طرح اکثر دبے دلوں میں دبے ہوئے جوش کو متحرک کرنے کے لیے کسی ظاہری تحریک کی ضرورت ہوتی ہے۔ اپنی مصیبت کا تجربہ اور دوسروں کی مصیبت کا نظارہ بسا اوقات دل میں وہ بیراگ پیدا کر دیتا ہے جو صحبت مطالعہ اور خلقی مناسبت کے اثر سے بھی ممکن نہ تھا، اگرچہ پرتاپ چند کے دل میں نیک اور بے غرض زندگی بسر کرنے کا خیال پہلے ہی سے تھا مگر نفس کے اس تازیانہ نے وہ منزل ایک ہی لمحہ میں طے کر دی جس کے طے

کرنے میں برسوں لگتے۔ اس کی زندگی کا ارادہ مستقل ہو گیا۔ معمولی صورتوں میں قومی خدمت ہی اس کی زندگی کا ایک دلچسپ اور غالباً ضروری مشغلہ ہوتی مگر ان واقعات کی تہہ میں کوئی غیبی طاقت متحرک تھی۔ کون کہہ سکتا ہے۔

ہردوار سے بہت دور شمال کی طرف پیچدار پہاڑوں میں ایک چشمے کے کنارے ایک نوجوان بیٹھا ہوا نظر آتا تھا، جگہ بہت خوفناک تھی، درندے دن دہاڑے چہل قدمیاں کرتے تھے۔ مگر یہ شخص شب و روز ایک ہی چٹان پر بیٹھا رہتا اس کا جگر بہت مضبوط تھا۔ اس کے چہرے سے وحشت برستی تھی۔ کپڑے پھٹ کر تار تار ہو گئے تھے۔ بال بڑھ آئے تھے مگر بظاہر ان باتوں کی اسے مطلق پروا نہ تھی۔

اس کے پاس نہ اوڑھنا تھا نہ بستر، نہ برتن نہ بھانڈے، کبھی کبھی جنگل پھل کھا لیا کرتا تھا۔ ایسا بے سروسامان آدمی کس نے دیکھا تھا۔ یہ پرتاپ چند تھا۔

پرتاپ چند کو یوں بسر کرتے کئی مہینے گزر گئے۔ وہ اپنے نفس سے لڑ رہا ہے مگر فتح نہیں ہوتی تھی اس نے دشمن کو جیسا حقیر سمجھا تھا اس سے بدرجہا طاقت ور پایا، جس وقت وہ الہ آباد میں تھا، ذاتی عیش اور تنعم کے خیالات اس کے دل میں نام کو بھی نہ آتے تھے مگر اس ویرانے میں بار بار اس کا خیال انہیں باتوں کی طرف جھکتا۔ وہ خیالات کے مجتمع کرنے میں کامیاب نہ ہوتا۔ اکثر اس کی نگاہوں کے سامنے ایک نازنین کی تصویر آ کر کھڑی ہو جاتی جو برجن سے بہت مشابہ تھی۔

تخیل ایک عالیشان مکان بنواتا، اسے شیشہ و آلات و نواز سے سجاتا۔ جاں بخش نغموں کی میٹھی الاپ کانوں میں آنے لگتی۔ عاشقانہ چھیڑ چھاڑ اور معشوقانہ شریر اداؤں کے دور چلنے لگتے۔ گھنٹوں اسی پرسرور خواب کے مزے اڑاتا۔ پھر یکایک چونک اٹھتا کہ میں کیا بیہودہ باتیں سوچ رہا ہوں اور خیالات کو ادھر سے ہٹا کر مسئلہ پیش نظر پر جماتا۔ مگر جھرنوں کی شیریں نوائیاں اور غزالوں کی کلیلیں خیالات کے

قدم میں زنجیر گرانبار کا کام کرتیں۔ یہاں تک کہ وہ اٹھ کھڑا ہوتا اور دل میں کہتا کہ میری زندگی یونہی خواب دیکھنے میں گزرے گی۔

رفتہ رفتہ اس کی یہ حالت ہوگئی کہ کھانے پینے کی مطلق سدھ نہ رہتی۔ سویرے سے شام تک دیوانہ وار بیٹھا ہوا درختوں کی شاخوں اور پتھر کی چٹانوں سے نظریں ملایا کرتا تھا۔ خیال کی طاقت بڑی زبردست ہوتی ہے۔

قومی خدمت کے خیال میں غرق رہتے رہتے اس کے دل میں درد کا سچا جذبہ پیدا ہوا جس کے بغیر بے غرض خدمت محال ہے۔ کسی بوڑھے ضعیف کو لکڑیاں توڑتے دیکھتا تو خود اس کی لکڑیاں توڑ کر اس کے گھر تک پہنچا آتا۔ بھولے بھٹکے مسافروں کو ساتھ لے کر آبادی تک جاتا۔ ان کاموں میں اسے روحانی مسرت حاصل ہوتی۔ یہاں تک کہ آس پاس کی آبادیوں میں ان نیک کاموں کا شہرہ ہوگیا۔ لوگ سمجھنے لگے کہ کوئی مہاتما رشی ہیں۔

عورتیں آتیں کہ مجھے سال بھر سے لڑکا نہیں ہوا۔ کوئی تعویذ دیجئے۔ مرد آتے کہ میرے روزگار کی فکر کر دیجئے۔ آخر پرتاپ چند یہاں سے بھاگا اور دشوار گزار گھاٹیوں کو چیرتا ہوا بہت دور نکل گیا۔ یہاں ایک اونچی چوٹی پر ایک چھوٹی سی منڈیا تھی۔ اس کے قریب ایک چٹان پر اس نے اپنا آسن جمایا۔

یہاں رہتے اسے چھ مہینے گزر گئے اور اب اسے اپنے دل میں ایک باطنی طاقت محسوس ہونے لگی۔ جذب خیال کی قوت پیدا ہوگئی۔ مگر اس کی آتما ابھی تک کمزور تھی۔ اس کا ثبوت بھی اسے جلدی مل گیا۔

ایک روز وہ شام کے وقت بیٹھا ہوا تھا کہ یکایک شیر کی ہولناک گرج اس کے کانوں میں آئی۔ آواز سنتے ہی اس کے رونگٹے کھڑے ہوگئے اور دل دھڑکنے لگا۔ مگر وہ سنبھل کر بیٹھا اور ادھر ادھر چوکنی نگاہوں سے تاکنے لگا کہ آواز کدھر سے آئی ہے۔